بازیاں کھیلی تھیں وہ سارے نقشے اسے یاد تھے، مگر یہ نقشہ کہاں دیکھا۔

دفعتہً اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ رما راجہ صاحب نے یہ نقشہ دیا تھا۔ لگا تار تین دن دماغ لڑانے کے بعد اس نے اسے حل کیا تھا۔ پھر تو اسے ایک ایک چال یاد آگئی۔ ایک ہی لمحہ میں نقشہ حل ہو گیا۔ اس نے مسرت کے نشے میں زمین پر دو تین قلابازیاں کھائیں۔ موچھوں پہ تاؤ دیا آئینہ میں منہ دیکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

دیبی دین ابھی آگ سلگا رہا تھا کہ رما خوش خوش آ کر بولا۔ دادا جانتے ہو صداقت اخبار کا دفتر کہاں ہے۔

دیبی۔ جانتا کیوں نہیں ہوں۔ یہاں کون اخبار ہے جس کا پتہ مجھے معلوم نہ ہو۔ صداقت کا ایڈیٹر ایک رنگیلا آدمی ہے جو ہر دم منہ میں پان بھرے رہتا ہے۔ مگر ہے ہمت کا دھنی۔ دو بار جیل ہو آیا ہے۔

رما۔ آج ذرا وہاں تک جاؤ گے۔

دیبی دین نے عذر کیا۔ مجھے بھیجکر کیا کرو گے؟

رما۔ کیا بہت دُور ہے۔

دیبی۔ نہیں دور تو نہیں ہے۔

رما۔ پھر بات کیا ہے؟

دیبی دین نے خطا وارانہ انداز سے کہا۔ بات کچھ نہیں ہے۔ بڑھیا بگڑتی ہے اسے بچن دے چکا ہوں کہ سودیشی بدیشی کے جھگڑے میں نہ پڑوں گا۔ نہ کسی اخبار کے دفتر میں جاؤں گا۔ اس کا دیا کھاتا ہوں تو اس کا حکم بھی تو بجانا پڑے گا۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ دادا تم دل لگی کرتے ہو۔ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے اس اخبار میں شطرنج کا ایک نقشہ چھپا ہے۔ جس پر پچاس روپے انعام ہے۔ جواب چھپ جائے تو مجھے وہ انعام مل جائے۔ اخباروں کے دفتر میں اکثر خفیہ

پولیس کے آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہی ڈر ہے نہیں تو میں خود چلا جاتا۔

دیبی دین۔ تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے!

رما۔ تو پھر کیا ڈاک سے بھیجدوں!

دیبی۔ نہیں ڈاک سے کیا بھیجو گے۔ سادہ لفافہ ادھر اُدھر ہو جائے تو تمہاری محنت اکارت جائے۔ رجسٹری کراؤ تو کہیں برسوں پہنچے گا۔ کل اتوار ہے کسی اور نے جواب بھیج دیا تو انعام وہ مارے جائیگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اخبار والے دھاندلی کر بیٹھیں اور تمہارا جواب اپنے نام سے چھاپ کر روپے ہضم کر لیں۔

رما نے شش و پنج میں پڑ کر کہا۔ تو میں ہی چلا جاؤں گا۔

دیبی۔ تمہیں میں نہ جانے دونگا۔ کہیں پھنس جاؤ گے بس۔

رما۔ پھنسنا تو ایک دن ہی ہے۔ کب تک چھپا رہوں گا۔

دیبی۔ تو جب پھنسو گے تب دیکھی جائے گی۔ لاؤ میں چلا جاؤں۔ بڑھیا سے کوئی بہانہ کروں گا۔

یہ کہتے ہوئے دیبی دین نے اپنا کالا کمبل اوڑھا رما سے لفافہ لیا اور چل دیا بڑھیا ساگ بھاجی لینے منڈی گئی تھی۔ آدھ گھنٹے میں سر پر ٹوکری رکھے اور ایک بڑا سا ٹوکرا مزدور کے سر پر رکھوائے آئی۔ پسینہ سے تر تھی۔ آتے ہی بولی کہاں گئے ذرا بوجھ تو اتارو۔ گردن ٹوٹ گئی۔

رما نے آگے بڑھ کر ٹوکری اتروائی۔ اتنی بھاری تھی کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی بڑھیا نے پوچھا وہ کہاں گئے۔

رما نے بہانہ کیا۔ مجھے تو نہیں معلوم ابھی اسی طرف گئے ہیں۔

بڑھیا نے مزدور کے سر سے ٹوکرا اتروایا اور زمین پر بیٹھ کر ایک ٹوٹی ہوئی پنکھیا جھلتی ہوئی بولی۔ جیس کی چاٹ لگی ہوئی ہوگی اور کیا؟ میں مر مر کر کماؤں اور

یہ بیٹھے بیٹھے موج اڑاویں، چرس پئیں۔

رما جانتا تھا۔ دیبی دین چرس پیتا ہے لیکن بڑھیا کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بولا۔ کیا چرس پیتے ہیں، میں نے تو نہیں دیکھا۔

بڑھیا نے پیٹھ کی ساڑھی ہٹا کر اسے پنکھے کی ڈنڈی سے کھجلاتے ہوئے کہا۔ ان سے کوئی نشہ چھوٹا ہے۔ چرس یہ پئیں، گانجہ یہ پئیں، شراب انہیں چاہیئے، بھنگ انہیں چاہیئے۔ ہاں ابھی تک افیم نہیں کھائی۔ یا رام جانے کھاتے ہوں۔ میں کون ہر دم دیکھتی ہوں۔ میں تو سوچتی ہوں کون جانے آگے کیا ہو۔ ہاتھ میں چار پیسے رہیں گے تو پرائے بھی اپنے ہو جائیں گے، مگر اس بھلے آدمی کو رتی بھر فکر نہیں ہوتی کبھی تیرتھ ہے کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ میرا تو ناک میں دم آگیا۔ بھگوان اٹھا لیتے تو گلا چھوٹ جاتا۔ تب یاد کریں گے لالہ۔ تب جگو کہاں ملے گی جو کما کما کے گل چھرے اڑانے کو دیا کرے گی۔ تب سر پہ ہاتھ رکھ کر روئیں تو کہہ دینا کوئی کہتا تھا (مزدور سے) کے پیسے ہوئے تیرے۔

مزدور نے بڑی جلاتے ہوئے کہا۔ پوچھا دیکھ لو دائی، گردن ٹوٹ گئی۔

جگو نے بے رحمانہ انداز سے کہا۔ ہاں ہاں گردن ٹوٹ گئی بڑے نازک ہو نا۔ یہ لے کل پھر چلے آنا۔

مزدور چلا گیا۔ تو بڑھیا کو حساب کی یاد آئی۔ رما سے بولی۔ بھیا! ذرا آج کا کھرچا تو ٹانک لو۔ بجار میں تو جیسے آگ لگ گئی ہے۔

بڑھیا جھونپڑیوں میں چیزیں لگا لگا کر رکھتی جاتی تھی اور حساب بھی لکھاتی جاتی تھی آلو۔ ٹماٹر۔ کدو۔ کیلے، پالک، رسیم سب چیزوں کا تول اور دام اسے یاد تھا۔ رما سے دوبارہ پڑھوا کر سنا تب اسے اطمینان ہوا۔ ان کاموں سے فرصت پا کر اس نے اپنی چلم بھری اور موڑھے پر بیٹھ کر پینے لگی۔ لیکن اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ

وہ تمباکو کا مزا لینے کے لئے نہیں دل کو جلانے کے لئے پی رہی ہے۔ ایک لمحہ بعد پھر بولی۔ دوسری دوسری عورت ہوتی تو گھڑی بھر ان کے ساتھ نباہ نہ ہوتا۔ گھڑی بھر بہریات سے چکی میں جت جاتی ہوں اور دس بجے رات تک دکان پر بیٹھی ستی ہوتی رہتی ہوں۔ کھاتے پیتے بارہ بجتے ہیں تب جا کر چار پیسے دکھائی دیتے ہیں اور میں جو کچھ کماتی ہوں اسے یہ نشے میں اڑا دیتا ہے۔ رات کوٹھری میں چھپا کر رکھوں مگر اس کی نگاہ پہنچ جاتی ہے۔ کبھی ایک آدھ چیز بنوا لیتی ہوں تو وہ آنکھوں میں گڑنے لگتی ہے۔ بھگوان نے لڑکوں کا سکھ بھوگنا نہیں لکھا تھا تو کیا کروں۔ چھاتی پھاڑ کر مر جاؤں۔ مانگنے سے موت بھی تو نہیں ملتی۔ سکھ بھوگنا لکھا ہوتا تو جوان بیٹے کیوں چل دیتے۔ اور اس بیکرٹ کے ہاتھوں میری یہ سانت ہوتی۔ اسی نے سودیشی کے جھگڑے میں پڑھ کر میرے لالوں کی جان لی۔ آؤ اس کوٹھری میں بھیا۔ تمہیں مگدر کی جوڑی دکھاؤں۔ دونوں اس جوڑی کے پانچ پانچ سو ہاتھ پھیرتے تھے۔

اندھیری کوٹھری میں جا کر رما نے مگدر کی جوڑی دیکھی۔ ان پر وارنش تھی۔ صاف ستھری گویا کسی نے ابھی پھیر کر رکھ دیا ہو۔ بڑھیا نے غرور آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ لوگ کہتے تھے یہ جوڑی مہاماں کو دے دے۔ تجھے دیکھ دیکھ کر کلک ہوگا میں نے کہا یہ جوڑی میرے لالوں کی جوڑی ہے یہی میرے دونوں بیٹے ہیں۔

آج رما کے دل میں بڑھیا کی جانب سے بے اندازہ عقیدت پیدا ہوئی۔ کتنا زاہدانہ توکل ہے! کتنی پاکیزہ محبت، جس نے لکڑی کے ان دو ٹکڑوں کو زندگی عطا کی ہے رما نے جگو کو حرص اور طمع میں ڈوبی ہوئی پیسے پر جان دینے والی نازک جذبات سے عاری سمجھ رکھا تھا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ ضعیفہ کا دل کتنا نازک، کتنا دلیر، کتنا مہر پرور ہے۔

بڑھیا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے

ہوئے تھے آج دونوں کے دل رشتۂ محبت میں مربوط تھے۔ ایک طرف مادرانہ شفقت تھی دوسری طرف فرزانہ سعادت مندی، وہ کدورت جو اب تک نادانستہ طور پر دونوں کو الگ کئے ہوئے تھی، آج یکایک مٹ گئی۔

بڑھیا نے کہا، منہ ہاتھ دھو لیا ہے بٹیا! بڑے میٹھے سنترے لائی ہوں، ایک لیکر چکھو تو۔

رما نے سنترہ کھاتے ہوئے کہا، آج سے میں تمہیں اماں کہا کرونگا۔

بڑھیا کے ٹھنڈے، خشک بے نور اور بخیل آنکھوں سے موتی کے سے دو قطرے نکل پڑے۔

اتنے میں دیبی دین دبے پاؤں آکر کھڑا ہو گیا۔ بڑھیا نے تڑپ کر پوچھا۔ اتنے سویرے کدھر سواری گئی تھی سرکار کی؟

دیبی دین نے سادگی سے مسکرا کر کہا۔ کہیں نہیں جرا ایک کام سے چلا گیا۔

کیا کام تھا جرا میں بھی سنوں یا میرے سننے کے لائق نہیں ہے۔

پیٹ میں درد تھا بید جی کے پاس چورن لینے چلا گیا تھا۔

جھوٹے ہو تم۔ اڑوس سے جو تمہیں جانتا نہ ہو، تم چرس کی ٹوہ میں گئے تھے۔

نہیں تیرے سر کی قسم تو جھونٹ مونٹ مجھے بدنام کرتی ہے۔

تو پھر کہاں گئے تھے تم۔

بتا تو دیا۔ رات کو کھانا ڈٹ کر زیادہ کھا گیا تھا سو پیٹ پھول گیا اور کھٹی کھٹی۔

جھوٹ ہے سراسر جھوٹ ہے تمہارا منہ صاف کہے دیتا ہے کہ یہ بہانہ ہے تم چرس یا گانجے کی ٹوہ میں گئے تھے میں ایک نہ مانوں گی۔ تمہیں اس بڑھاپے میں نسے کی سوجھتی ہے یہاں میری مرن ہوئی جاتی ہے، سویرے کے گئے گئے نو بجے لوٹے ہیں جیسے یہاں انکی لونڈی کا ہے۔

دیبی دین نے ایک جھاڑو لے کر دکان میں جھاڑو لگانا شروع کیا۔ بڑھیا نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور پوچھا۔ تم اب تک تھے کہاں۔ جب تک یہ نہ بتاؤ گے گھر میں گھسنے نہ دونگی۔

دیبی دین نے سٹ پٹا کر کہا۔ کیا کرے گی پوچھ کر۔ ایک اخبار کے دفتر میں گیا تھا جو چلے سے سجا دے۔

بڑھیا نے ماتھا ٹھونک کر کہا۔ تم نے پھر وہی لت پکڑی۔ تم نے کان نہ پکڑا تھا کہ اب پھر کبھی ادھر نہ جاؤنگا۔ بولو یہی منہ تھا کہ کوئی اور؟

تو بات تو سمجھتی نہیں بگڑنے لگتی ہے۔

خوب سمجھتی ہوں اخبار والے دنگا مچاتے ہیں اور گریبوں کو جیل لیجاتے ہیں۔ آج بیس سال سے دیکھ رہی ہوں کیا بڑھاپے میں جیل کی روٹیاں توڑو گے۔

دیبی دین نے ایک لفافہ رما ناتھ کو دے کر کہا۔ یہ روپے ہیں بھیا کے۔ لو یہ روپے وصول کرنے گیا تھا جی نہ مانتا ہو تو آدھے لے لے۔

بڑھیا نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ اچھا تو تم اپنے ساتھ بھیا کو بھی ڈبانا چاہتے ہو۔ تمہارے روپے میں آگ لگا دونگی۔ تم روپے مت لینا بھیا۔ مصیبت میں پھنس جاؤ گے اب سیت میں آدمی نہیں ملتے تو سب لالچ دے کر لوگوں کو پھانستے ہیں۔ بازار میں پہرا دلا دینگے۔ عدالت میں گواہی کرا دیں گے۔ پھینک دو اس کے روپے۔ جتنے روپے چاہو مجھ سے لے جاؤ۔

جب رما ناتھ نے سارا قصہ کہا تو بڑھیا کی تشفی ہوئی۔ چہرہ کی وہ تندی غائب ہو گئی خوش ہو کر بولی۔ اس میں سے میرے لئے کیا لاؤ گے بھیا۔

رما نے لفافہ اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ تمہارے ہی روپے تو ہیں۔ اماں، میں روپے لے کر کیا کرونگا۔

پھر کیوں نہیں بھیج دیتے؟
میرا گھر یہی ہے اماں! کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔
بڑھیا کا حسرت نصیب دل شگفتہ ہو گیا۔ اس فرزانہ محبت کے لئے کتنے دنوں سے اس کی روح بے قرار تھی۔ اس حسین دل میں محبت کا جو خزانہ جمع ہو گیا وہ سب ماں کے سینے میں جمع ہونے والے دودھ کی طرح بیٹے پر نثار ہونے کے لئے للچا اٹھا۔
بڑھیا نے نوٹوں کو گن کر کہا۔ پچاس ہیں بیٹا! پچاس مجھ سے اور لے لو۔ چائے کا پتیلا رکھا ہوا ہے چائے کی دکان کھول لو۔ یہیں ایک طرف چار پانچ موڑھے اور ایک میز رکھ لینا۔ دو دو گھنٹہ سانجھ سویرے بیٹھ جاؤ گے تو گجر بھر کو مل جائے گا۔
دین دین بولا۔ تب چرس کے پیسے میں اس دکان سے لے لیا کرونگا۔
بڑھیا نے مسرور اور مخمور آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ کوڑی کوڑی کا حساب لے لونگی۔ اس پھیر میں نہ رہنا۔
رما اپنے کمرہ میں گیا تو اس کا دل بہت خوش تھا۔ آج اسے وہی مسرت ہو رہی تھی جو گھر کی یاد دلاتی تھی گھر پر جو پیار ملتا تھا وہ اس کا حق تھا۔ یہاں جو پیار ملا گویا آسمان سے ٹپکا تھا۔
وہ نہا دھو کر پوجا کا سوانگ بھرنے بیٹھا کہ بڑھیا آکر بولی۔ بیٹا تمہیں روٹی بنانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے ایک مسرانی ٹھیک کر دی ہے۔ وہ تمہارا کھانا پکا دے گی دھرم کرم سے رہتی ہے بھیّا۔ ایسی بات نہیں ہے۔
ان ضعیف آنکھوں میں گہری دلاز والی مادریت جھلک رہی تھی۔ اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنےٰ کی تمیز خود بخود مٹ گئی بولا۔ جب تم میری ماں ہو گئیں تو پھر کیا فرق۔ میں تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤنگا۔
بڑھیا نے زبان دانتوں سے دبا کر کہا۔ ارے نہیں بیٹا۔ میں تمہارا دھرم نہ لوں

گی کہاں تم براہمن کہاں ہم کھٹک۔ ایسا بھی کہیں ہوا ہے۔
میں تمہاری رسوئی میں کھاؤنگا۔ جب ماں باپ کھٹک ہیں تو بیٹا بھی کھٹک ہی ہے۔

اور جو تمہارے گھر والے سنیں تو کیا کہیں۔
مجھے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں ہے۔ آدمی گناہ سے نیچا ہوتا ہے۔ کھانے پینے سے نیچا نہیں ہوتا۔ پریم سے جو کھانا ملتا ہے وہی پاک ہوتا ہے۔ اس سے تو دیوتا بھی انکار نہیں کر سکتے۔

بڑھیا کے دل میں بھی اپنے ذات کی امتیاز کا جذبہ پیدا ہوا۔ بولی بیٹا! کھٹک کی کوئی نیچی ذات نہیں ہے۔ ہم لوگ براہمن کے ہاتھ کا بھی بھوجن نہیں کھاتے۔ کہار کے ہاتھ کا پانی تک نہیں پیتے۔ ماس مچھلی ہاتھ سے نہیں چھوتے۔ کوئی کوئی سراب پیتے ہیں۔ لیکن چھپ کر۔ اس نے کسی کو نہیں چھوڑا بیٹا! بڑے بڑے ملک دھاری گٹا گٹ پیتے ہیں لیکن میری رٹ نہیں اچھی لگیں گی۔

رمانے مسکرا کر کہا۔ پریم کی روٹیوں میں امرت رہتا ہے۔ چاہے گیہوں کی ہوں یا باجرے کی۔

بڑھیا یہاں سے چلی تو گویا انچل میں مسرت کا خزانہ بھرے ہوئے ہو۔

(۲۸)

جب سے رما چلا گیا تھا رتن کو جالپا کے بارے میں بہت تشویش ہو گئی۔ وہ کسی بہانے سے اس کی مدد کرتے رہنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ جالپا کسی طرح تا نہ جائے۔ اگر کچھ روپے خرچ کرکے بھی وہ رما کا پتہ لگا سکتی تو خوشی سے خرچ کر دیتی۔ جالپا کی وہ روتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کا دل مسوس اٹھتا تھا۔ وہ اُسے بشاش دیکھنا چاہ

تھی۔ اپنے اندھیرے روپنے گھر سے اد ب کر وہ جالیپا کے گھر چلی جایا کرتی تھی، وہاں گھڑی بھر ہنس بول لینے سے اس کا دل خوش ہوجاتا تھا۔ اب بھی وہاں وہی نحوست چھا گئی۔ یہاں تک آکر اسے محسوس ہوتا تھا کہ میں بھی دنیا میں ہوں۔ اس دنیا میں جہاں زندگی ہے تمنّا ہے محبّت ہے اور مسرّت ہے۔ اس کی اپنی زندگی تو فرض کی قربان گاہ کی نذر ہو چکی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ شہر کے معززاور خوشحال گھروں سے رتن کے مراسم تھے لیکن جہاں اعزاز تھا وہاں تکلف تھا۔ نمائش تھی حسد تھا، غیبت تھی، کلب کی صحبت سے بھی اسے نفرت ہو گئی تھی، وہاں تفریح ضرور تھی لیکن مردوں کی عاشقانہ نگاہیں بھی تھیں بیقرار دل بھی رندانہ بذلہ سنجیاں بھی۔ جالپا کے گھر اگر وہ شان نہ تھی، وہ دولت نہ تھی تو وہ نمائش بھی نہ تھی۔ وہ تنگ دل بھی نہ تھی۔ رما جوان تھا خوش رُو تھا ممکن ہے شوقین بھی ہو، مگر رتن کو ابھی تک اس کے متعلق کسی قسم کا شبہ کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا اور جالپا جیسی نازنین کی موجودگی میں اس کا امکان بھی نہ تھا۔

زندگی کے بازار میں اور سبھی دکانداروں کی دغابازیوں سے تنگ آکر اس نے اس چھوٹی سی دکان میں آکر پناہ لی تھی، مگر یہ دکان ٹوٹ گئی۔ اب وہ کس بازار میں زندگی کی جنس خریدے گی سچّا مال پائے گی۔

ایک دن وہ گراموفون لائی اور شام تک بجاتی رہی۔ دوسرے دن تازہ میووں کی ایک ٹوکری لاکر رکھ دی۔ جب وہ آتی تو کوئی نہ کوئی سوغات لے آتی۔ اب تک وہ جالپا سے بہت کم ملتی تھی۔ مگر اب اکثر اس کے پاس آ بیٹھتی تھی اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی کبھی کبھی اس کے سر میں تیل ڈالتی۔ اور اس کے بال گوندھتی، گوپی اور بشمبر سے بھی اب اسے محبّت ہو گئی تھی، کبھی کبھی دونوں کو موٹر پر سیر کرانے لے جاتی۔ اسکول سے آتے ہی دونوں بھی اس کے بنگلے پر پہنچ جاتے اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ان کے شور وغل میں رتن کو دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

ایک دن رتن آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ جالپا نے پوچھا کیا آج طبیعت اچھی نہیں ہے۔

رتن نے غم ناک لہجہ میں کہا۔ طبیعت تو اچھی ہے مگر آج رات بھر جاگنا پڑا۔ رات سے وکیل صاحب کو بہت تکلیف ہے۔ جاڑوں میں انہیں دمہ کا دورہ ہو جاتا ہے بے چارے جاڑوں بھر دوائیں کھاتے رہتے ہیں۔ مگر یہ مرض گلا نہیں چھوڑتا۔ کلکتہ میں ایک نامی بید ہیں اب کے انہیں سے علاج کرانے کا ارادہ ہے۔ کل چلی جاؤں گی۔ مجھے ساتھ لے جانے کا تو ارادہ نہیں ہے کہتے ہیں وہاں بڑی تکلیف ہوگی۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کسی کو ساتھ تو رہنا ہی چاہیئے۔ وہاں دوبار ہو آئی ہوں اور جب گئی ہوں بیمار ہو گئی ہوں۔ مجھے وہاں ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اپنے آرام کو دیکھوں یا ان کی بیماری کو دیکھوں۔ اگر کوئی میرا سب کچھ لے کر بھی انہیں اچھا کر دے تو میں خوشی سے دے دوں۔

جالپا نے پوچھا۔ یہاں کسی بید کو نہیں بلایا۔

یہاں کے بیدوں کو دیکھ چکی۔ بید۔ ڈاکٹر۔ حکیم کوئی تو نہیں بچا۔

پھر کب تک آؤ گی۔

کچھ ٹھیک نہیں۔ ان کی بیماری پر ہے۔ ایک ہفتہ میں آجاؤں یا مہینہ دو مہینے لگ جائیں۔ مگر جب تک بیماری کی جڑ نہ ٹوٹ جائے گی نہ آؤں گی۔

تقدیر غیب میں بیٹھی ہوئی ہنس رہی تھی۔ جالپا دل میں مسکرائی جس بیماری کی جڑ جوانی میں نہ ٹوٹی بڑھاپے میں کیا ٹوٹے گی۔

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا۔ تم بھی چلتیں تو بڑا مزا آتا۔

جالپا نے دردناک انداز سے کہا۔ کیسے چلوں بہن۔ جانے بھی پاؤں۔ یہاں دن بھر آس لگی رہتی ہے۔ کوئی خبر آتی ہوگی۔ وہاں میرا جی اور بھی گھبرائے گا۔

میرا دل تو کہتا ہے بابو جی کلکتے ہی میں ہیں ---

تو ذرا اِدھر اُدھر تلاش کرنا۔ اگر کوئی خبر ملے تو مجھے اطلاع دینا۔

اس کے لئے تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے جالپا۔

یہ مجھے معلوم ہے خط برابر بھیجتی رہو گی۔

ہاں ضرور، روز نہیں تو ایک روز ناغہ دے کر ضرور لکھونگی۔

جالپا پان بنانے لگی، رتن اس کے چہرے کی طرف منتظر آنکھوں سے تاکتی رہی گویا کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر حجاب کے باعث کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جالپا نے پان دیتے وقت اس کے دل کی بات بھانپ کر کہا۔ کیا ہے بہن کیا کہہ رہی ہو۔

میرے پاس کچھ روپے ہیں تم رکھ لو، میرے پاس رہیں گے تو خرچ ہو جائیں گے۔

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ اور جو مجھ سے ہی خرچ ہو جائیں۔

رتن خوش ہو کر بولی۔ تمہارے ہی تو ہیں بہن، کسی غیر کے تو نہیں ہیں۔

جالپا خیال میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف تاکتی رہی، کچھ جواب نہ دیا۔ رتن نے سمجھا اسے اعتراض ہے، شکوہ کے انداز سے بولی۔ تم نے کچھ جواب نہ دیا بہن، میری سمجھ میں نہیں آتا تم مجھ سے کھچی کیوں رہتی ہو۔ میں چاہتی ہوں مجھ میں اور تم میں ذرا بھی مغائرت نہ رہے لیکن تم مجھ سے دور بھاگتی ہو۔ مان لو میرے سو پچاس روپے تمہیں سے خرچ ہو گئے تو کیا ہوا۔ بہنوں میں تو ایسا کوڑی کوڑی کا حساب نہیں ہوتا۔

جالپا نے متین لہجہ میں کہا۔ کچھ کہوں بُرا تو نہ مانو گی

بُرا ماننے کی بات ہو گی تو ضرور بُرا مانوں گی۔

ممکن ہے تمہیں بری لگے۔ لیکن میں تمہارا دل دکھانے کے لئے نہیں کہتی، تم اپنے دل میں سوچو۔ تمہارے اس بہلاوے میں رحم یا امداد کا خیال شامل ہے یا نہیں، تم میری غریبی پر ترس کھا کر۔

رتن نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر دیا اور بولی۔ بس اب رہنے

دو۔ تم چاہے جو سمجھو، مگر یہ خیال کبھی میرے دل میں نہ تھا نہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اگر بھوک لگی ہو تو تم سے بے تکلف کہہ بیٹھوں۔

جالپا نے اسی بیگانہ پن سے کہا۔ تم ایسا کہہ سکتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ کسی دوسرے موقعہ پر تم روٹیوں کے عوض بیوے کھلا سکتی ہو۔ لیکن ایشور نہ کرے کوئی ایسا موقع آئے جب تمہارے گھر میں روٹی کا ٹکڑا نہ ہو۔ تو شاید تم اتنی بے تکلف نہ ہو سکو۔

رتن نے بے ساختہ پن سے کہا۔ مجھے اس حالت میں بھی تم سے مانگنے میں حجاب نہ ہوگا۔ دوستی حالات کی پرواہ نہیں کرتی۔ ایسی باتیں کر کے تم میرا دروازہ بند کر رہی ہو۔ میں نے سمجھا تھا تمہارے ساتھ زندگی کے دن کاٹ دونگی۔ لیکن تم ابھی سے دامن چھڑائے لیتی ہو۔ بدنصیبوں کو پریم کی بھیک بھی نہیں ملتی۔

یہ کہتے کہتے رتن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جالپا اپنے کو غم نصیب سمجھتی تھی اور غم نصیبوں کو تلخ حق کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ رتن کی مصیبت اس کی مصیبت سے کہیں زیادہ دل شکن ہے۔ جالپا کو شوہر کے لوٹ آنے کی اب بھی امید تھی۔ اس کے آتے ہی اس کے ایام غم بھول جائیں گے۔ اس کی امیدوں کا آفتاب پھر روشن ہوگا۔ اس کی آرزوئیں پھر پھلیں پھولیں گی۔ آنے والا زمانہ اپنی ساری آرزوئیں اور ترغیبوں کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ روشن، دلفریب اور وسیع۔ رتن کا مستقبل کیا تھا کچھ نہیں، گہری تاریکی۔

رتن آنکھیں نیچی کر کے کھڑی ہوئی۔ خطوں کا جواب دیتی رہنا۔

جالپا نے کہا روپے دیتی جاؤ۔

رتن نے تھیلی سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن اس کے چہرے پر خوشی نہ تھی۔ جالپا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کیا برا مان گئیں۔

رتن نے روٹھ کر کہا۔ برا مان کر تمہارا کیا کر لونگی!

جالپا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ فرطِ الفت سے اس کا دل لہلہا اٹھا۔ رتن سے اُسے اتنی محبت کبھی نہ ہوئی تھی، وہ اب تک اس سے کھنچتی تھی جلتی تھی۔ آج اسے رتن کی اصلی صورت نظر آئی۔ اس نے سوچا یہ سچ مچ بدنصیب ہے اور مجھ سے زیادہ۔ ایک لمحہ میں رتن آنکھوں میں آنسو اور ہنسی ایک ساتھ بھرے ہوئے رخصت ہو گئی۔

(۳۹)

کلکتہ میں وکیل صاحب کے ٹھہرنے کے لئے پہلے ہی انتظام کر لیا گیا تھا۔ کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ رتن نے مہراج اور ٹمبل کہار کو ساتھ لے لیا تھا۔ دونوں وکیل صاحب کے پرانے ملازم تھے اور گھر کے آدمی ہو گئے تھے۔ شہر کے باہر ایک بنگلہ میں تین کمرے لے لئے گئے تھے۔ احاطہ میں طرح طرح کے پھول پودے لگے ہوئے تھے۔ بڑی فرحت کی جگہ تھی۔ قرب و جوار میں اور کتنے ہی بنگلے تھے۔ شہر کے لوگ ادھر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے، اور ہرے ہو کر لوٹتے تھے مگر رتن کو جگہ بھاڑے کھاتی تھی۔ بیمار کے تیماردار بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ افسردہ دلوں کے لئے جنت بھی ویران ہے۔

سفر نے وکیل صاحب کو اور بھی مضمحل کر دیا۔ دو تین دن تو ان کی حالت پہلے ابتر ہو گئی، لیکن معالجہ شروع ہونے کے بعد وہ کچھ سنبھلنے لگے۔ رتن صبح سے آدھی رات تک ان کی چارپائی کے پاس ہی کرسی ڈالے بیٹھی رہتی۔ وکیل صاحب چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے ہٹ جائے تو دل کھول کر کراہیں۔ اسے تشفی دینے کے لئے وہ اپنی حالت بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

وہ پوچھتی آج کیسی طبیعت ہے تو وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔ آج تو جی بہت ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ بیچارے ساری رات کروٹیں بدل کر کاٹتے تھے۔ مگر رتن پوچھتی رات نیند آئی تھی تو کہتے۔ ہاں خوب سویا۔ رتن جب کھانا لے کر جاتی

تو رغبت نہ ہونے پر بھی کھا لیتے، رتن سمجھتی تھی اب یہ اچھے ہو رہے ہیں، دکھیراج سے بھی وہ یہی کیفیت بیان کرتی تھی، دکھیراج بھی اپنے معالجہ کی کامیابی پر خوش تھے۔

ایک دن وکیل صاحب نے رتن سے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ اچھا ہونے کے بعد بھی مجھے تمہاری دوا نہ کرنی پڑے۔

رتن نے خوش ہو کر کہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ میں تو ایشور سے مناتی ہوں کہ وہ تمہاری بیماری مجھے دے دیں۔

شام کو گھوم آیا کرو۔ اگر بیمار پڑنے کی خواہش ہو تو میرے اچھے ہونے پر پڑنا۔ کہاں جاؤں، میرا تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے یہیں سب سے اچھا لگتا ہے۔

وکیل صاحب کو یکایک رمانا تھ کا خیال آگیا۔ بولے ذرا شہر کے پارکوں میں گھوم گھام کے دیکھو شاید رمانا تھ کا پتہ چل جائے۔

رتن کو اپنا وعدہ یاد آگیا۔ اسے ملاقات ہو جانے کی اُمید نے ایک لمحہ کے لئے اسے بیتاب کر دیا۔ کہیں وہ پارک میں بیٹھے مل جائیں تو پوچھوں، کہئے بابو جی اب بھاگ کر کہاں جائیے گا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا بولی۔ جا لیا سے میں نے وعدہ تو کیا تھا لیکن یہاں آکر بھول گئی۔

وکیل صاحب نے اصرار کر کے کہا۔ آج چلی جاؤ۔ آج کیا شام کو روز، گھنٹہ بھر ٹہل آیا کرو۔

رتن نے تشویش کے ساتھ کہا۔ لیکن فکر تو نہ لگی رہے گی۔

وکیل صاحب نے مسکرا کر کہا۔ میں تو اچھا ہو رہا ہوں۔

رتن بے دلی سے بولی۔ اچھا چلی جاؤں گی۔

مگر رتن کو کل سے وکیل صاحب کی تشفی انگیز باتوں پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔

ان کی صورت سے اچھے ہونے کی کوئی علامت نہیں نظر آتی تھی۔ اگر وہ اچھے ہو رہے ہیں تو ان کا چہرہ روز بروز کیوں زرد ہوتا جاتا ہے آنکھیں کیوں ہر وقت بند رہتی ہیں، جسم کیوں گھلتا جاتا ہے۔ مہراج اور خدمتگار سے وہ اپنا شبہ نہ ظاہر کر سکتی تھی، کبیراج سے پوچھتے بھی شرم آتی تھی۔

اگر کہیں رامل جائے تو ان سے پوچھتی، ممکن ہے کسی ڈاکٹر سے ان کی ملاقات ہو۔ ان کبیراج سے وہ کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔

جب رتن چلی گئی تو وکیل صاحب نے ٹیل سے کہا۔ مجھے ذرا اٹھا کر بٹھا دو ٹیل پڑے پڑے کمر سیدھی ہو گئی۔ ایک پیالی چائے پلا دو۔ کئی دن ہو گئے چائے کی صورت نہیں دیکھی۔ مجھے مارے ڈالتا ہے دودھ کی صورت دیکھ کر بخار چڑھ آتا ہے مگر ان کی خاطر سے پی لیتا ہوں۔ مجھے تو ان کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔

ٹیل نے وکیل صاحب کو تکیہ کے سہارے بٹھا کر کہا۔ بابوجی یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا۔ بہوجی کے ڈر کے مارے نہیں کہتا تھا۔

وکیل صاحب ایک منٹ تک خاموش رہ کر بولے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔

ٹیل! بالکل نہیں۔ مجھے دوزخ اور بہشت پر بالکل یقین نہیں ہے سا اگر آدمی کو اپنے اعمال کے مطابق جنم لینا پڑتا ہے تو مجھے یقین ہے کہ میرا جنم کسی اچھے گھر میں ہوگا۔ تاہم مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں مر گیا تو کیا ہوگا۔

ٹیل بولا۔ بابوجی آپ ایسی باتیں نہ کریں، بھگوان چاہیں گے تو آپ اچھے ہو جائیں گے۔ کہئے تو کل کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ آپ لوگ تو انگریزی پڑھے ہیں۔ کچھ مانتے ہی نہیں۔ مجھے تو کوئی دوسرا پھیر معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گنواروں کی بھی سن لیا کیجئے۔ آپ مانو یا نہ مانو، میں تو ایک سیانے کو لاؤں گا۔

وکیل صاحب نے منہ پھیر لیا۔ جن و آسیب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کئی سیانوں کو پیٹ چکے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شعبدہ بازی ہے، بالکل دیا کاری۔ لیکن اس وقت انہیں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ ٹمیل کی اس تجویز سے اختلاف کرتے!

مہراج نے چائے لاکر کہا۔ سرکار چائے پی لیجئے۔

وکیل صاحب نے چائے کے پیالے کو گرسنہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ لے جاؤ اب نہ پیوں گا۔ بہوجی کو معلوم ہو گیا تو ناراض ہوں گی، ایک منٹ کے بعد پھر وہ بولے۔ کیوں مہراج جب سے میں آیا ہوں میرا چہرہ کچھ ہرا ہوا ہے۔

مہراج نے ٹمیل کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ رُخ دیکھ کر رائے دیا کرتے تھے خود اپنی رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں نہ تھی، اگر ٹمیل نے کہا ہے آپ اچھے ہو رہے ہیں تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ ٹمیل نے اس نے خلاف کہا ہے تو انہیں بھی خلاف کہنا چاہیئے۔ ٹمیل نے ان کی پریشانی کو بھانپ کر کہا۔ ہرا کیوں نہیں ہوا ہے، ہاں مگر جتنا چاہیئے اتنا نہیں ہوا ہے۔

مہراج بولے، ہاں کچھ ہرا جرور ہوا ہے مگر بہت کم۔

وکیل صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد انہیں ضعف ہو جاتا تھا اور دس پانچ منٹ خاموش پڑے رہتے تھے۔ شاید انہیں اپنی حالت کا واقعی علم ہو گیا تھا اس کے چہرے پر عقل پر دماغ پر موت کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ اگر کچھ اُمید تھی تو اتنی ہی کہ شاید دل کی کمزوری سے انہیں اپنی حالت سے مایوسی ہو رہی ہو۔ ان کا دم پہلے سے زیادہ پھولنے لگا تھا، کبھی کبھی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب جان نکل جائیگی۔ نزع کی حالت طاری ہو جاتی تھی، کون جانے یہی حبس دم ذرا اور بڑھ کر زندگی کا خاتمہ کر دے۔

سامنے باغ میں چاندنی کہرے کی چادر اوڑھے زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔

پھول اور پودے سر جھکائے امید اور خوف سے بے قرار ہو کر گویا اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے تھے اس کے ٹھنڈے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے اور آنسوؤں کی دو بوندیں گرا کر پھر المناک آنکھوں سے تاکنے لگتے تھے۔

دفعتہً وکیل صاحب نے آنکھیں کھولیں، آنکھوں کے دونوں گوشوں میں آنسو کی دو بوندیں مچل رہی تھیں۔ پھر آہستہ سے بولے۔ ٹمیل کیا سدھو آ گئے تھے پھر اس سوال پر آپ ہی آپ شرمندہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سدھو آئے ہوں پھر گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

سدھو، اس کے بیٹے کا نام تھا جوان موت مر چکا تھا۔ اس وقت وکیل صاحب کو بار بار اسی کی یاد آ رہی تھی، کبھی اس کا بچپن سامنے آ جاتا۔ کبھی اس کی موت آنکھوں میں پھر جاتی۔ اس کا حافظہ کبھی اتنا روشن۔ کبھی اتنا صحیح نہ تھا۔

کئی منٹ کے بعد انہوں نے پھر آنکھیں کھول دیں اور ادھر اُدھر کھوئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ میری ماں آ کر پوچھ رہی ہے بیٹا تمہاری طبیعت کیسی ہے دفعتہً انہوں نے ٹمیل سے کہا۔ یہاں آؤ۔ جا کر کسی وکیل کو بلا لاؤ۔ جلد آنا ورنہ ہو جی آتی ہوں گی۔

اتنے میں موٹر کار کا ہارن سنائی دیا۔ اور ایک لمحہ میں رتن آ پہنچی۔ وکیل کو بلانے کی بات ٹل گئی۔

وکیل صاحب نے چہرہ کو بشاش بنا کر پوچھا۔ کہاں کہاں ہو آئیں۔ کچھ رمانا تھ کا پتہ ملا۔

رتن نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ کئی جگہ گئی وہ کہیں نہیں دکھائی دیتے اتنے بڑے شہر میں سڑکوں کا پتہ تو جلدی چلتا نہیں، وہ بھلا کیا ملیں گے۔ دوا کھانے کا وقت تو آ گیا ہوگا۔

وکیل صاحب نے دبی زبان سے کہا۔ لاؤ کھالوں۔

رتن نے دوا نکالی اور انہیں اٹھا کر پلائی۔ اس وقت وہ نہ معلوم کچھ خالف سی ہو رہی تھی۔ ایک نامعلوم دہشت اس کے دل پر غالب تھی۔

یکایک اس نے کہا۔ ان لوگوں میں سے کسی کو تار دے دوں؟

وکیل صاحب نے پرسوال نظروں سے دیکھا۔ پھر آپ ہی آپ اس کا مطلب سمجھ کر بولے۔ نہیں نہیں، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر ایک لمحہ کے بعد اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کر کے بولے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی وصیت لکھا دوں جیسے ایک ٹھنڈی تیز نکیلی چیز رتن کے تلوؤں سے گھس کر سر سے نکل گئی۔ گویا اس کے جسم کی ساری بندشیں کھل گئیں۔ سارے اعضاء بکھر گئے۔ جیسے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اوپر سے آسمان اڑ گیا اور اب وہ بےحس بےجان معلق کھڑی ہے۔ روندھے ہوئے گلے سے بولی گھر سے کسی کو بلاؤں۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے۔

اپنوں کے لئے رتن اس وقت بیقرار ہو اٹھی۔ کوئی بھی تو اپنا ہوتا۔ جس پر وہ تکیہ کر سکتی۔ گھر کے لوگ آجاتے تو دوڑ دھوپ کر کے کسی دوسرے ڈاکٹر کو لاتے۔ وہ اکیلی کیا کرے۔ آخر بھائی بند اور کس دن کام آئیں گے۔ مصیبت میں ہی تو اپنے کام آتے ہیں۔ پھر یہ کیوں کہتے ہیں کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔

وصیت کی بات اُسے پھر یاد آگئی۔ یہ خیال کیوں ان کے دل میں پیدا ہوا؟ ویدجی نے تو کچھ کہا نہیں۔ کیا ہونے والا ہے۔ ایشور یہ خیال اس کے دل کو بےچین کرنے لگا۔ اس کی طبیعت آواز بلند سے رونے کے لئے مائل ہو گئی۔ اپنی ماں یاد آئی۔ اپنی ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر رونے کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔

مہراج نے آکر کہا۔ سرکار کھانا تیار ہے تھالی پروسوں۔

رتن نے اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بغیر انتظار کئے چلا گیا۔

مگر ایک ہی لمحہ میں مہراج پر رتن کو رحم آگیا۔ اس نے کیا خطا کی جو کھانے کے لئے پوچھنے آیا۔ کھانا بھی ایسی چیز ہے جسے کوئی چھوڑ سکے، وہ رسوئی میں جاکر بولی۔ تم لوگ کھا لو مہراج مجھے آج بھوک نہیں ہے۔

مہراج نے اصرار کیا، دو ہی لقمے کھا لو سرکار!

رتن کھٹک گئی۔ مہراج کے اصرار میں اتنا خلوص، اتنی ہمدردی بھری ہوئی تھی کہ رتن کو ایک طرح کی تشفی کا احساس ہوا۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے یہ کتنا غلط خیال ہے مہراج نے اب تک رتن کو تند مزاج مالکن کی صورت میں دیکھا تھا۔ وہی مالکن آج اس کے سامنے کھڑی گویا ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

رتن نے پوچھا، کیوں مہراج تمہارا کیا خیال ہے۔ بابوجی کو اس کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ ہو رہا ہے۔

مہراج نے ڈرتے ڈرتے وہی الفاظ دوہرائے جو آج وکیل صاحب سے کہے تھے۔ کچھ کچھ تو ہو رہا ہے۔ مگر جتنا چاہیئے اتنا نہیں۔

رتن نے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تم بھی مجھے دھوکا دیتے ہو مہراج۔

مہراج کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور بولے۔ بھگوان سب اچھا ہی کریں گے۔ بہوجی گھبرانے سے کیا ہوگا۔ اپنا تو کوئی اختیار نہیں۔

رتن نے پوچھا، یہاں کوئی جوتشی تو نہ ملے گا۔

مہراج نے سرگوشی کے ساتھ کہا۔ یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا بہوجی۔ لیکن بابوجی کا مزاج تو جانتی ہو ان باتوں سے کتنا چڑتے ہیں۔

رتن نے تاکید کر کے کہا، سویرے کسی کو ضرور بلا لانا۔

یہ کہتی ہوئی وہ کمرے میں آئی اور جالپا کو یہ خط لکھنے لگی۔

بہن نہیں کہہ سکتی کیا ہونے والا ہے آج مجھے معلوم ہوا کہ میں کتنے بڑے مغالطہ

میں پڑی ہوئی تھی۔ وکیل صاحب اب تک مجھ سے اپنی حالت چھپاتے تھے، مگر آج یہ بات ان کے قابو سے باہر ہو گئی۔ رتن سے کیا کہوں آج وہ وصیت لکھوانے جا رہے تھے۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تھوڑی سی سنکھیا کھا کر سو رہوں۔ ایشور کو دنیا رحیم اور کریم اور جانے کیا کیا کہتی ہے۔ میں کہتی ہوں اس سے زیادہ بے رحم اور سنگ دل کوئی دشمن بھی نہیں ہو سکتا۔ پچھلی زندگی کا قصہ محض دل کو سمجھانے کے لئے ہے جس سزا کا سبب ہی ہمیں معلوم نہ ہوا۔ اس سزا کی وقعت ہی کیا۔ وہ تو زبردست کی لاٹھی ہے جو اپنے لئے کوئی حیلہ گھڑ لیتی ہے۔ اس اندھیرے ہولناک پُرخار شاہراہ زندگی میں مجھے صرف ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ملا تھا۔ اُسے انچل میں چھپائے ایشور کا گیت گاتی ہوئی اپنی حالت پر شاکر چلی جا رہی تھی۔ لیکن آج وہ چراغ بھی مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ اس اندھیرے میں میں کہاں جاؤں گی۔ کون میرا رونا سُنے گا۔ کون میری بانہہ پکڑے گا۔

بہن مجھے معاف کرنا مجھے بابو جی کی تلاش کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ آج شہر کی سڑکوں کا چکر لگا آئی ہوں۔ کچھ موقع ملا تو پھر جاؤں گی۔

یہ خط لکھ کر رتن برآمدہ میں آئی۔ دیکھا وکیل صاحب کی سانس زوروں سے چل رہی تھی۔

(۳۰)

رات کے تین بج چکے تھے۔ رتن آدھی رات کے بعد آرام کرسی پہ لیٹے ہی لیٹے جھپکیاں لے رہی تھی کہ یکایک وکیل صاحب کے گلے کی گھر گھراہٹ سن کر چونک پڑی۔ الٹی سانس چل رہی تھی وہ ان کے سرہانے چارپائی پر بیٹھ گئی اور ان کا سر اٹھا کر اپنی جانگھ پر رکھ لیا ابھی نہ جانے کتنی رات باقی تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی تین بجے تھے سویرا ہونے میں چار گھنٹے کی دیر تھی۔ کبیراج کہیں نو بجے آئیں گے۔ گھر میں چار دن